خطباتِ سید العلماءؒ

گذشتہ سے پیوستہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

فرائض حج میں بھی سعی کی اہمیت ظاہر ہے جس کا پس منظر یہ کہ خلیل حق نے دودھ پیتے بچہ کو اس کی ماں کے ساتھ بے آب و گیاہ میدان میں پہنچا دیا۔ چلتے وقت ایک کوزہ آب اور دو چار روٹیاں دے گئے، وہ کب تک چلیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے ماں پر بھوک اور پیاس کا غلبہ ہوا مگر ماں نے اس کو برداشت کیا۔ اس کے بعد ایک وقت وہ آیا کہ بچہ کی فطری غذا کا خزانہ ختم ہو گیا۔ اب بچہ پر بھوک پیاس کا غلبہ ہوا۔ جب ماں نے بچہ کو تڑپتا دیکھا تو کھڑی ہو گئیں اور صفا و مروہ دو پہاڑیوں پر گئیں تلاش آب کے لئے۔ اب خیال ہوا کہ بچہ اکیلا ہے تو دوڑ کر بچہ کے پاس آئیں اور پھر بچہ کا تڑپنا دیکھا نہ گیا تو دوبارہ تلاش آب کے لئے پہاڑی پر گئیں۔ سات دفعہ آئیں اور گئیں۔ عقل سے پوچھئے وہ قادر مطلق جو بعد میں زمزم کو نمودار کر سکتا تھا کیا وہ اس پر قادر نہ تھا کہ پہلے ہی جب غلبۂ عطش ہوا تو زمزم نمودار کر دیتا۔ لیکن اسے تو یہ سنت قائم رکھنا تھی کہ پہلے سعی کرو۔ پھر نتیجہ کا انتظار کرو۔ سعی کرو تو رحمت الٰہی تمہارے شامل حال ہو گی۔

اب قیامت تک کے لئے مسلمانوں کو بھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان گردش کرنا ہے اور اس کا نام وہی ''سعی'' ہے۔

یہ سعی کیا ہے؟ ایک بی بی کے عمل کی شبیہ ہے ورنہ ہم جو سعی کرتے ہیں تو کیا ہم تلاش آب کرتے ہیں؟ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل مقصد عمل کا تعلق صاحب عمل سے ہوتا ہے اور بعد میں ہمارا کام اس کی یاد کا قائم رکھنا ہوتا ہے۔ صفا و مروہ وہ دونوں پہاڑیاں جہاں یہ سعی ہوئی تھی شعائر اللہ کا جزو بن گئیں۔ حالانکہ جناب ہاجرہ کا صرف قدم مس ہوا تھا۔ ان کے پاؤں سے خون کا قطرہ نہیں ٹپکا تھا۔ پھر بھی یہ دونوں پہاڑ شعائر اللہ بن گئے تو جس زمین میں شہیدوں کا خون جذب ہو گیا ہو، وہ زمین کیا شعائر اللہ میں داخل نہیں ہو گی؟

مناسک حج میں زیادہ تر ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی یادگاریں ہی ہیں ارشاد ہوا ہے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰاھِمَ مُصَلًّی۔

ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنی نماز کا مقام بناؤ۔
اسی بناء پر نماز طواف مقام ابراہیم میں پڑھی جاتی ہے۔
اب بتایئے کہ کیا ابراہیمؑ کا تصور اس نماز میں نہیں رہے گا؟
جو مقاصد الٰہی میں اپنی زندگی صرف کرتے ہیں، ان کی یاد مرضیٔ الٰہی سے ہوتی ہے۔

منیٰ کی قربانی میں حاجی کتنا روپیہ صرف کرتا ہے؟ اور مسلمانوں کا اتنا پیسہ بلا وجہ صرف ہوتا ہے، مگر نہیں یہ بلا وجہ نہیں ہے۔ خاصان الٰہی کی یاد قائم کرنا خود اتنا گرانقدر مقصد ہے جس کے مقابلے میں معاشی پہلو کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ قربانی کیا ہے؟ آخر اس میں دس ذی الحجہ کی کیا

خصوصیت ہے چونکہ آج سے مدتوں پہلے یہ قربانی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس دن اس قربانی کو یاد کرو۔

پھر اگر لفظی یاد کافی ہوتی ہے تو قربانی ابراہیمؑ کی متعلقہ آیتیں پڑھ لیتے مگر خالق فطرت واقف ہے کہ فطرت انسانی میں لفظی یاد اتنی اثر انداز نہیں ہوتی جتنی کوئی مجسم شکل میں عملی صورت، یہ قربانی شبیہ عمل خلیل ہے۔ وہ سعی شبیہ مادر اسماعیل تھی پھر ان جانوروں کو دیکھئے۔ یہ کس کے شبیہ ہیں؟ یہ شبیہ اسماعیل تو نہیں ہیں کیونکہ اسماعیل کا ذبح عملی طور پر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ وہ رنج ہوئے نہیں بلکہ یہ شبیہ اس گوسفند کی ہے جو فدیہ بن کر آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانور جو کسی ولی خدا کے کام آئے، اس کی بھی یادگار رمنا نا خالق کو پسند ہے۔ اس کے بعد ذوالجناح کی شبیہ پر کسی کو معترض نہ ہونا چاہئے۔

فریضۂ اسلامی انسانی کسی قربانی کا بھلانا نہیں ہے۔ ۱۰ ذی الحجہ کو فرزند خلیل کی قربانی ہے اور ۱۰ محرم کو فرزند حبیب حق کی قربانی۔

جناب ابراہیمؑ سے ہمارا اعتقادی رشتہ ہے۔ عملی رشتہ نہیں اور اپنے رسولؐ سے عملی رشتہ بھی ہے کہ ان کے تعلیمات پر ہمیں کاربند ہونا ہے تو فرزند خلیل کی قربانی کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے اور خود اپنے رسول کی قربانی یاد رکھنے کے قابل نہ ہوگی؟

اب کوئی کہے کہ وہ یاد تو بطور عید ہے۔ یہاں غم کیوں کیا جاتا ہے میں کہتا ہوں کہ یہ نتیجہ کے فرق کی بنا پر ہے۔ روز قربانی اسماعیل روز عید ہے اس لئے کہ دنبہ آ گیا اور نبی زادہ بچ گیا مگر دس محرم کو فرزند رسولؐ ذبح ہو گیا، اس لئے روز غم ہے۔

اور یہ تصور کہ جو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو، اسے رونا نہیں چاہئے غلط ہو گیا۔ جناب حمزہ کی مثال سے کہ جب آپ شہید ہوئے تو رسولؐ کی خواہش کے مطابق انصار کی عورتیں خانۂ جناب حمزہ میں آ کر صفیہ کو پُرسا دے کر گریہ کرنے لگیں اور آواز گریہ رسولؐ تک پہنچی تو آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، اے بی بیو اللہ تم سے راضی ہو تمہارے شوہروں سے راضی ہو تمہاری اولاد سے راضی ہو۔ اب انصاف سے دیکھئے پیغمبرؐ خدا نے خواتین اغیار کے گریہ کی آوازوں پر حسرت سے فرمایا تھا:

اَمَّا عَمِّی حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ۔

میرے چچا حمزہ پر رونے والیاں نہیں ہیں تو اگر رسولؐ کربلا میں ہوتے تو یہ نہ فرماتے کہ

اَمَّا وَلَدِیْ حُسَیْنٌ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ۔

میرے فرزند حسینؑ پر رونے والا کوئی نہیں ہے اور پھر زیادہ حسرت ناک بات یہ ہے کہ رونے والے ہوں مگر رونے نہ دیا جائے۔

امام حسینؑ کو رونے والے موجود تھے۔

زینبؑ، ام کلثوم ایسی بہنیں، فاطمہؑ سکینہ ایسی بیٹیاں لیلیٰؑ ورباب ؑ ایسی بیویاں اور سید الساجدین ایسے فرزند مگر............

مگر یہ لوگ رونے کہاں پائے؟ جو رونے کا خاص وقت تھا، اس وقت خیموں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بی بیوں کا عالم یہ تھا کہ ایک خیمہ میں آگ لگتی تھی تو دوسرے خیمے میں چلی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ آگ کے شعلوں میں سب خیام گھر گئے مگر اب بھی گھبرا کے قدم باہر نہیں نکلتے۔ سمٹ سمٹ کر ثانیٔ زہراء حضرت زینبؑ کے پاس آئیں کہ آپ جانشین فاطمہؑ ہیں، بتایئے ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہیں کیا کریں؟

حضرت زینبؑ، یقیناً مسئلہ شرعی سے واقف تھیں مگر فریضہ حجاب کی اہمیت دکھانا تھی کہ فرماتی ہیں بی بیو! مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟ خدا امام وقت کو زندہ رکھے بغیر اس سے پوچھے میں کیا جواب دوں؟ آئیں۔ اب سید سجادؑ کے

پاس...... دیکھئے یہ امتحان کیسا سخت ہے؟ ہمارے چوتھے امام سے باپ کے بعد بحیثیت امام مسئلہ کیا پوچھا جاتا ہے؟ وہ یہ ہے کہ پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں، کہتی ہیں، بیٹا دیکھو چاروں طرف خیموں میں آگ کے شعلے بلند ہیں۔ اب تم امام وقت ہو، بتاؤ حکم خدا اس وقت کیا ہے۔ جل کر مر جائیں یا خیموں سے باہر نکلیں اور اب سید سجادؑ کو کہنا پڑتا ہے کہ اب خیموں سے باہر نکلئے اور وہ بی بیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اٹھا تھا، خیموں سے روز روشن میں باہر آتی ہیں اس طرح کہ لَا طِمَاتُ الْوُجُوْہِ نَاشِرَاتُ الشُّعُوْرِ۔ ''اپنے منھ پر طمانچے مارتی ہوئیں بال سروں کے بکھرائے ہوئے۔''

(۲)

(۱۲/نومبر ۱۹۷۷ء ۱۱/بجے دن، فیض آباد)

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّیُرَوْا اَعْمَالَھُمْ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

دوسرا شعبۂ آخرت کی کامیابی کے لئے عمل۔ اب دنیا کے مقاصد کے لئے کوئی زاہد کہہ سکتا تھا کہ ہمیں مال کی ضرورت نہیں۔ کامیابی دنیا کی ضرورت نہیں مگر کیا کوئی مومن ایسا ہے جو کہے مجھے جنت کی ضرورت نہیں یا نجات آخرت کی ضرورت نہیں۔ یہ تو وہی کہے گا جو آخرت کا قائل نہ ہو تو جنت اور کم از کم نجات ہر فرد مسلم کا نصب العین ہے۔ مگر تصور یہی ہے کہ ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے۔ نتیجہ بہتر سے بہتر حاصل ہو اور سعی کا سوال پیدا نہ ہو۔ مگر میں پورے مطالعہ قرآن کے سہارے سے عرض کر رہا ہوں کہ قرآن میں آخرت کی نوید ہر جگہ عمل پر دی گئی ہے اور جن جن مختلف الفاظ سے اس مقصد کو نمایاں کیا گیا ہے، ان پر اگر کتاب لکھی جائے تو ہر قسم کے آیات کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ آیت جو میرا سرنامۂ کلام ہے کہ ''آخرت میں تمام لوگ نکلیں گے۔ گروہ در گروہ تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں تو جو ذرّہ برابر بھی عمل خیر کرے گا، وہ اسے دیکھ لے گا وہ جو ذرہ بھی عمل شر کرے گا اسے دیکھ لے گا۔'' یہ ایک باب کی نمائندہ ہے جو عمل کے عنوان سے ہے دوسری صنف ان آیات کی ہے جو سعی کے عنوان سے ہیں: مثلاً

مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَشْکُوْرًا۔

جو آخرت کو پیش نظر رکھے۔ اور اس کی خاطر وہ سعی بھی کرے جو اس کے لئے درکار ہے درحالانکہ وہ مومن ہو تو اس کی سعی کی ناقدری نہیں ہوگی۔

بعض آیات میں محسن کی لفظ آئی ہے۔ قرآن حسن عمل کو احسان کہتا ہے یہ یہود و نصاریٰ کا تصور تھا کہ جماعتی طور پر ہم نجات اور داخلۂ جنت کے حقدار ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَا کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصَارٰی تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ۔

''ان کا قول ہے کہ بہشت میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا، سوا اس کے جو یہودی ہو (یہ یہودی کہتے ہیں) یا عیسائی ہو (یہ نصاریٰ کا قول ہے)۔

ہماری عام ذہنیت کے مطابق اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ واہ مسلمانوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جا سکتا۔

مگر یہ جواب ہی کیا تھا، یہ جو دعووں کا ٹکرانا ہوتا جیسے وہ ان کا ایک نعرہ تھا ویسے ان کے بالمقابل مسلمانوں کا ایک نعرہ ہو جاتا۔

قرآن کہتا ہے ان کے جواب میں یہ کہو کہ اگر تم سچے ہو تو

اپنی دلیل پیش کرو۔ اب اس سے یہ اصول قائم ہو گیا کہ بغیر دلیل کے کسی کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

انھوں نے کہا تھا سوا یہود ونصاریٰ کے کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے کیوں نہیں! مگر اب یہ نہیں کہا جاتا کہ مسلمان یقیناً جنت میں جائیں گے۔ اگر یہ مسلمان کہا جاتا تو وہ ایک جماعت کا لقب قرار پاجاتا لہٰذا مسلمان نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ جو اپنے چہرہ کو بالکل اللہ کی طرف موڑ دے یعنی جو مسلم بتایا جارہا ہے۔

''اور اس کے ساتھ حسنِ عمل رکھتا ہو'' تو اس کے لئے اس کا اجر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ یا یہ کہ اجر ہے جس سے سمجھا جاتا کہ ہر مسلم کے لئے نیک عمل ہو۔ ایک معین اجر ہے جو یکساں طور پر ملے گا۔ بلکہ لَهُمْ اَجْرُهُمْ ان کے لئے ان کا اجر ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی جتنا حسنِ عمل عمل ہوا تنے اجر کا حق ہے۔ اور انجام میں نہ ان کے لئے خوف ہے، نہ ان کے لئے۔ ایک جگہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا۔ خدا نہیں برباد کرتا اجر کو اس کے جو اپنے اعمال کو درست رکھے۔

ایسی ہی کتنی آیتیں قرآن کی ہیں جن میں عمل کی اہمیت، دکھائی گئی ہے۔

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اسلام دین عمل ہے۔ اب کتنی عبرت کی بات ہے کہ جس قوم کی بنیادی کتاب میں اتنا عمل پر زور دیا گیا ہو، اس قوم میں یہ تصور پیدا ہوجائے کہ اعمال کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر مسلمانوں کے اندر کوئی خاص جماعت ایسی ہو کہ وہ نجات کو اپنا خصوصی حق سمجھ لے کہ صرف ہم نجات کے حقدار ہیں تو دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں میں اس جماعت کا امتیاز خاص کیا ہے؟

توحید مشترک، نبوت مشترک، قیامت مشترک، فرقۂ ناجیہ کا امتیاز صرف عدل وامامت سے ہے۔ اور اسی لئے ہم اپنے کو امامیہ کہتے ہیں۔ اب اس جماعت کے کچھ افراد کو تصور ہو کہ ہمیں عمل کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے تصور کا تو لازمی نتیجہ ہے پیروی، اور یہ نبوت ورسالت وامامت ان سب کے لغوی معانی سے ظاہر ہے۔ نبوت اور رسالت جس کا حامل نبی ورسول ہوتا ہے، ان لفظوں کا براہ راست تقاضہ وجوب اطاعت نہیں ہے۔ ان دونوں منصبوں کے علاوہ امامت ہے جس کا حامل امام ہوتا ہے۔ یہ ہمارا خبری امین ہے۔ اب تینوں کے لغوی معنی ملاحظہ ہوں۔

نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا تو دوسروں کا کام کیا ہے۔ تصدیق کرنا۔ رسالت کے معنی پیغام پہنچانا تو دوسروں کا کام ہے پیغام کو قبول کرنا۔ لیکن امام کے معنی ہیں۔ آگے آگے چلنے والا تو دوسروں کا کام کیا ہے؟ پیچھے پیچھے چلنا۔ اب اس سے ایک اور پہلو پر توجہ فرمایئے۔ نبی کے معنی خبر دینے والا تو نبی کی ضرورت اس وقت تک کہ جب تک کوئی ایک خبر بھی پہنچانا باقی ہے۔ رسول کا کام پیغام پہنچانا تو جب تک کوئی پیغام پہنچانا باقی ہے اس وقت تک یہ کام ہے اور جب یہ آخری پیغام پہنچا دیا اور تکمیل دین ہوگئی تو اب رسول کی ضرورت نہیں لیکن امام کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا تو جب تک جادہ باقی ہے اور چلنے والے موجود ہیں، تب تک رہنمائی باقی رہنا ضروری ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے نماز میں امام جماعت ہوتا ہے تو اس کی پیروی اتنی ضروری ہے کہ رکوع رکن نماز ہے۔ پسندہ خدا ہے مگر امام سے پہلے ہوگیا تو باطل۔ سجدہ محبوب ترین عمل ہے

مگر امام سے پہلے ہوگیا تو باطل۔ اب انصاف کیجئے کہ امام جماعت کی متابعت ضروری ہو اور جو دین و دنیا کا کلیۃً امام ہو اس کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے اور افعال کی متابعت نہ ہو۔ کیا صرف بارہ امام کے نام سنا دینا ہی کافی ہے اور ان کی رہنمائی اور مثالی سیرت سے کوئی بحث نہیں۔ مگر یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں بلاتفریق فرقہ یہ بات ہوگئی ہے کہ عمل سے جان بچاتے ہیں۔ پہلے تمام مسلمانوں نے اپنے کو امت مرحومہ کہہ دیا مگر اس کی کوئی دلیل ہونا چاہئے۔ آخر کیا خصوصیت ہے کہ جو پوری کی پوری امت مرحوم ہوجائے۔ اس کی دلیل یہ کہی جاسکتی ہے کہ چونکہ ہم رحمۃ للعالمین سے وابستہ ہیں اس لئے رحمت الٰہی ہمارے شامل حال ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمارا راستہ رحمۃ للعالمین کے راستے سے الگ ہوگیا تو بتایئے رحمت الٰہی ادھر آئے گی یا اُدھر جائے گی؟

پھر امت ہونا تو ایک رشتہ ہے ہم رسولؐ سے رشتہ بتا رہے ہیں مگر رسول بھی تو ہمیں اپنی امت میں سمجھیں۔ قرآن مجید میں ایک رسول کی زبانی اعلان ہے:

مَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّی۔

''جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو پیروی نہیں کرتا وہ رسول سے تعلق نہیں رکھتا تو امت رسولؐ ہونا کیسا؟ پھر اس کے بعد رسولؐ اپنی امت فرما بھی دیں، اللہ بھی تو رسولؐ کی امت میں جانے۔ کوئی کہے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ رسولؐ اپنی امت کہیں اور اللہ قبول نہ کرے؟ میں کہتا ہوں کہ حضرت نوحؑ بھی تو رسول تھے، وہ کہہ رہے تھے ''اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ'' میرا بیٹا میرے اہل سے ہے۔ خالق نے پہلی نسبت کی نفی نہیں فرمائی۔ جواب میں یہ نہیں کہا کہ وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے مگر دوسری نسبت کے لئے کہا جاتا ہے۔ ''اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ'' وہ تمہارے اہل سے نہیں ہے۔ ''اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ'' اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اعمال وہ ہیں کہ بیٹا اہل سے خارج ہوجاتا ہے۔ امت ہونا کیا چیز ہے۔ اب جس پیغمبر خاتم کی زبان سے نوحؑ کا واقعہ ہم تک پہنچا ہے، وہ اگر چادر کھینچ کر کبھی کچھ افراد کے لئے کہہ دے۔

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَآءِ اَهْلِیْ۔ ''پروردگار! یہ میرے اہل ہیں'' تو اب دنیا نسبی رشتے نہ دیکھے کہ یہ داماد ہیں، وہ بیٹی ہیں، وہ نواسے ہیں بلکہ محسوس کرے کہ ان کا کردار اتنی بلندی پر ہے کہ پیغمبرؐ اپنے پیغمبرانہ ضمیر کے استحکام کے ساتھ خود اللہ سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں کہ یہ میرے اہل ہیں۔

بہرحال یہ تو تمام مسلمانوں کی بات تھی کہ انھوں نے من حیثیت الجماعت اپنے کو امت مرحومہ قرار دیا۔ اب امت کے ایک گروہ کا ذکر ہے جس نے اپنا لقب قرار دیا ''فرقۂ ناجیہ''، ''ناجیہ'' سے مطلب نجات پانے والے۔ وہ قرآنی مطالبہ کہ اپنی دلیل پیش کرو، ان کی طرف بھی متوجہ ہے مگر بحمداللہ فرقہ ناجیہ کی ایک فرد ہوتے ہوئے میں اس کی دلیل پیش کرسکتا ہوں۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثَةٍ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَةً کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً۔ ''میری امت کے تہتّر فرقے ہوں گے جن میں سب آتش دوزخ میں ہوں گے۔ سوا ایک فرقہ کے۔

اس سے سمجھ میں آیا کہ تجارت کے لئے امت میں ہونا کافی نہیں ہے۔ اس فرقہ میں ہونا ضروری ہے۔ اب پیغمبرؐ ہی نے پہچان بھی ناجی فرقہ کی بتائی ہے۔ ورنہ پیغمبرؐ خدا پر حرف آتا کہ نجات کے حقدار کی نشان دہی نہ کی۔ تہتّر راستوں میں ہم کیوں کر صحیح راستے کی شناخت کریں جو منزل تک پہنچائے۔ اگر پیغمبرؐ نہ بتاتے تو مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ رسولؐ کا دامن تھام

کر پوچھیں کہ اس فرقہ کی پہچان تو بتا دیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے بتایا، اگر بتایا نہ ہوتا تو اصحاب پوچھتے کیوں نہ؟ بے شک بتایا اوران الفاظ میں بتایا کہ:

مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِى كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرَقَ وَهَوٰى۔

''میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی اور جس نے تخلف کیا وہ ڈوبا اور گیا'' تخلف کے معنی کیا ہیں؟ کشتی پر نہیں بیٹھا یا بیٹھ کر راستے میں کسی منزل پر اتر گیا وہ فرقہ جو کشتی اہلبیتؑ میں سوار ہوا ہے، وہ ناجی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کشتیٔ اہلبیت پر بیٹھنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ استعارہ ہے۔ استعارہ کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ کوئی ایک بات مشتبہ اور مشبّہ میں مشترک ہوتی ہے، وہ وجہ جامعہ کہلاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کشتیٔ پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟

اس سوال کا مفہوم ان سوالات اوران کے جوابات سے واضح ہوگا آپ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں ہے۔ ساحل پر سے آپ کشتی کی تعریف کریں کہ بہت خوبصورت کشتی ہے، تو یہ کیا کشتی پر بیٹھنا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ نہیں، یہ کشتی پر بیٹھا نہیں ہے۔

اب دوسری بات، ساحل پر کھڑے ہی کھڑے کہنے لگیں کہ ہم اس کشتی کو بہت چاہتے ہیں اور دعوائے محبت صحیح بھی ہو، کیوں کہ اگر وہ کشتی قابل محبت ہے تو اس سے محبت ہونا چاہئے۔ یہ کوئی آپ کا کارنامہ نہیں ہے یہ اس کے حسن کا تقاضا ہے مگر محبت ساحل پر کھڑے کھڑے کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ اب اس کے بعد نازک تر منزل ہے کہ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی بھنور میں پڑ گئی۔ باد مخالف کے تھپیڑے پڑنے لگے اور آپ اس کی بربادی پر آنسو بہانے لگے۔ یہ آنسو بھی بے قیمت نہیں ہیں۔ دردِ دل کی دلیل ہیں۔ محبت کا ثبوت ہیں مگر وہ بات اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ساحل پر کھڑے کھڑے یہ آنسو بہانا بھی کشتی پر بیٹھنا نہیں ہے۔ پھر کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟

میری تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ کشتی پر جا کے بیٹھ گئے تو نہ ہماری ذاتی حرکت کچھ ہے، نہ ذاتی سکون، کشتی چلی تو ہم چلے، کشتی رکی تو ہم رُکے۔ بس اب کشتی اہلبیتؑ پر بیٹھنے کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ وہ یہ ہیں کہ اپنے حرکت وسکون کو تابع اہلبیتؑ بنا دو جہاں اہلبیتؑ نے قدم آگے بڑھائے ہوں وہاں قدم آگے بڑھاؤ جہاں تک گئے ہوں وہاں قدم روک لو تو یہ ہے کشتی اہلبیت پر بیٹھنا۔ اس صورت میں جہاں کشتی پہنچے گی وہاں ہم پہنچیں گے اس لئے معصومؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

فِى دَرَجَتِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔

''ہمارے پیرو ہمارے درجہ میں ہوں گے قیامت کے دن۔''

آج کہا جاتا ہے کہ جب ہم محب اہلبیت اور مومن ہیں تو ہمیں عبادت واطاعت کی کیا ضرورت ہے؟

حالانکہ منزل محبت وایمان میں ہم بریر ہمدانی یا حبیب بن مظاہر یا مسلم بن عوسجہ کے برابر ہرگز نہیں ہیں۔ کربلا میں تو فرائض انسانی کے تمام شعبوں کو زندہ رکھا گیا، چنانچہ نماز جیسی کربلا میں پڑھی گئی ویسی کبھی نہیں پڑھی گئی۔ دیکھئے! غیر معصومین کا ذوق عبادت بھی کربلا میں کتنا بلند تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ نماز پڑھ رہے ہیں اور تیر ادھر ادھر آ کر گر رہے ہیں تو جناب عباسؓ نے کہا کہ یہ نماز کا موقع ہے؟ حضرت علیؑ نے کہا کہ اے ابن عباس! اسی نماز کے لئے تو ہم جنگ کر رہے ہیں۔

یہاں امام کا عمل سامنے ہے۔ پھر بھی جناب ابن عباس حیرت سے سوال کررہے ہیں۔ اب ذرا ابوثمامہ صائدی کا ذوق عبادت دیکھئے کہ تیروں کی بارش ہے، ہنگام جنگ اور ادھر نگاہ آفتاب پر ہے فکر ہے کہ امام نہ کہنے پائیں اور ہم اپنے ذوق عبادت کا نذرانہ امام کی خدمت میں پیش کردیں۔ کہتے ہیں کہ مولا! تمنا یہ ہے کہ یہ نماز آپ کے ساتھ بجماعت ادا ہوجائے۔ ابوثمامہ کے کہنے پر امام دعائیں دیتے ہیں جیسے استاد شاگرد کے مکمل جواب پر خوش ہوکر دعائیں دے:

ذَکَرْتَ الصَّلٰوۃَ جَعَلَکَ اللّٰہُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ الذّٰاکِرِیْنَ نَعَمْ ھٰذَا اَوَّلُ وَقْتِھَا۔

تم نے خود سے نماز کو یاد کیا۔ اللہ تمہارا شمار نمازیوں اور یادرکھنے والوں میں کرے۔

ہاں ہاں یہ اول وقت نماز ہے۔ یہ ہے نگاہِ غیر معصوم کی عصمت جس کی سند امام دے رہے ہیں۔

ظہر کی نماز کس طرح ہوئی۔ سعید وزہیر سامنے کھڑے ہیں۔ تیر آتے ہیں اپنے اوپر روک کر نماز مکمل کراتے ہیں۔ یہ دو قربانیاں صرف نماز کے لئے تھیں۔ ادھر نماز ہورہی ہے ادھر تیر کھائے جارہے ہیں۔ کسی کو یہ سمجھنے کا حق نہیں کہ انھوں نے نہیں پڑھی، کون کہہ سکتا ہے کہ تیر کھانے کے لئے جھکے تو رکوع نہیں کیا او رسیدھے ہوئے تو قیام نہیں کیا اور اشاروں سے سجدے نہیں کرلئے۔ ہاں اس جماعت میں شریک نہیں تھے۔ ان کا بھی وہی ذوق عبادت تھا جو ابوثمامہ کا تھا، مگر اطاعت وحفاظت امام مقدم تھی اور اب یہ فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا، کہ ان کی نماز افضل ہے جو مولا کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے یا ان کی جو امام کے آگے کھڑے نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ امام کو نماز پڑھوا رہے تھے۔

ادھر امام نے سلام پھیرا اور سعید زمین پر گرے اور کہا:

اَوَفَیْتُ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ۔ مولا! کیا میں نے حق وفا ادا کردیا۔

فرمایا: نَعَمْ وَفَیْتَ جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْراً۔ ہاں تم نے حق وفا ادا کردیا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ نماز ظہر کا ذکر تھا...... بہت ممکن ہے کہ اسی وقت نماز عصر بھی بجماعت ادا ہوئی ہو کیونکہ سفر اور خوف میں باجماع امت جمع بین الصلوٰتین درست ہے۔ حضرت کے لئے اس وقت دونوں باتیں جمع تھیں۔ مگر ہمارے رہنمایان دین اور معصومینؑ بلاشبہ اوقات فضیلت پر الگ الگ نماز پڑھنے کے پابند تھے چنانچہ کتب مقاتل بتاتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے اس کے بعد آخری لمحۂ حیات میں نماز عصر ادا کی۔ مگر اس نماز کی پوری کیفیت بیان کرنے سے میری زبان قاصر ہے۔ بس اتنا کہوں گا کہ اب ذوالجناح کی پشت خالی ہوچکی تھی۔ اب راکب دوشِ رسولؐ زمین کے اوپر تھا۔ اس کے بعد نہ کہوں گا کہ رکوع کیونکر ہوا؟ قیام کس عالم میں ہوا؟ بس سجدہ کا ذکر اور اسی پر ختم مجلس۔ یقیناً علیؑ کا سجدہ بھی یادگار تھا۔ ۱۹ر رمضان کی صبح کو جس کا گواہ بعد میں طلوع ہونے والا سورج تھا اور حسینؑ کا یہ آخری سجدہ ہے ۱۰ر محرم کی عصر کا جس کا گواہ غروب کی طرف مائل ہوتا ہوا سورج ہے۔ مگر میں خود بارگاہ امیر المومنینؑ میں عرض کروں گا کہ یا علیؑ یقیناً آپ کی بھی نماز اور سجدے یادگار ہیں مگر آپ کو سجدہ سے سر اٹھانے کا موقع ملا۔ لیکن حسینؑ نے تو بس سر سجدہ میں دیا۔ وہ اس کے بعد بلند ہوا تو ظالموں کے ہاتھ سے نوکِ نیزہ پر۔

❁❁❁